کیونکہ ہم جسم میں چلتے تو ہیں مگر جسم کے طور پر لڑتے ہیں ۔ اسلیے کہ ہماری لڑائی کے ہتھیار جسمانی ہیں بلکہ خدا کی طرف سے قادر ہیں کہ قلعوں کو ڈھا دیں ہم تصورات کو ڈھا دیتے ہیں ۔ بلکہ ایک بلندی کو جو خدا کی پہچان کے خلاف بلند ہوتی ہے ۔ اور ہم ہر ایک ذہن کو قید کر کے مسیح کا فرمانبردار کر دیتے ہیں اور ہم تیار ہیں کہ جب تمہاری فرمانبرداری پوری ہو تو ہم ہر طرح کی نافرمانی کا بدلہ لیں ۔

نمبر 3۔حق تصنیف 20003۔جان ڈبلیو رونز پوسٹ آفس بکس 68، یونیکوئی،
ٹینسی 37692۔6 مئی 1941ء

ای میل:tjtriniyfound@aol.com
ویب سائیٹ:www.trinityfoundation.org
ٹیلی فون: 423-743-0199 فیکس: 423-743-2005

عالمی سطح پر پروٹسٹینٹ پر نظر

(ویسٹ منٹر سیمنری میں ابتدائیہ خطاب)

(جارڈن ایچ کلارک)

سابقہ مذہبی مردم شماری کی خبریں کافی پُر معنی تھیں ۔اُنکو پڑھ کر اگر حوصلہ نہیں ملتا تھا تو کم ازم کم معلومات ضرور ملتی تھیں ۔مجموعی طور پر آبادی میں شرح اضافہ اور کلیسیائی رُکنیت میں شرح اضافہ، میں بہت فرق رہا۔لیکن پروٹسٹینٹ طبقات میں سب سے زیادہ کلیسیائی رکنیت میں اضافہ لوتھرنز کا رہا۔اور رومن کیتھولک کلیسیا میں مذہبی تنظیموں میں اضافہ کا تناسب سب سے زیادہ تھا۔

رومن ازم کا جھوٹا وشواس اربت پرستی کا دستور،عمر بلوغت کی مخالفت انسانی ہمدردی کے خلاف نقطۂ نظر ،کشت وخون اور ایذ ارسانیوں کے

ساتھ رومن ازم کی سیاہ تاریخ، غیر ملکی پوپ کی اطاعت جو روحانی اور شاہی قوت تصور کیا جتا ہے، امریکن ازم کی تاریخی مخالفت، یہ سب کچھ شاید سمجھنے میں کافی مدد دے کہ کیوں امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں کیتھولک ازم یا رومن ازم پھیل گئی۔

اس کے اسباب کا اندازہ لگاتے ہوئے شاید کوء بھی غلطی نہیں کریگا۔ فقط قوت افرادی کی گنتی۔ علم اقلیدس کے مطابق کوئی بھی متحرک چیز اُس وقت زیادہ زور پکڑ لیتی ہے جب اُس میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا جائے۔ اسی طرح لوگوں کے ہجوم میں قوت پائی جاتی ہے جو مزید ہجوم کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اسی طرح جب کیتھولک کلیسیا کے بڑے بڑے گرجا گھروں میں لوگ جوق در جوق جب داخل ہوتے یا باہر نکلتے ہیں تو یہ مزید لوگوں کو اپنی طرف راغب کر لیتی ہے۔ لوگ چھوٹی یا کم تعداد والی جماعت میں شمولیت کی نسبت بڑی جماعت کو ترجیح دیتے ہیں اور جہاں زیادہ پیسہ ہوگا وہاں پر ہی لوگ ہونگے۔ اور رومن کیتھولک کلیسیا میں بہت سی تنظیمیں اس قوت میں مزید اضافہ کر رہی ہیں اسی لیے اُنکی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس سچائی کو بیان کرنے کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ پہلی، ہر روز تقسیم ہونے والے چھپن قسم کے اخبارات کے تین ماہ کے سروے کے مطابق ان اخبارات میں 268 فی صد جگہ کیتھولک مذہبی سرگرمیوں کی ہوتی ہے پھر 9.7 فی صد خبریں میتھوڈلیزم کی شائع ہوتی ہیں۔ اور دوسری مثال امریکہ کی متحدہ ریاستوں کے صدر کی بڑی غلطی کی ہے کہ اُس نے قوم کے بنیادی حق کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پوپ کے سفیر کو اپنے ملک میں رکھا ہوا ہے۔

بڑی وجاہات پر اگر بات کی جائے تو بہت سے طبقات مثلاً آرتھوڈکس پریسبٹرین چرچ نے زمانہ ساز بننے کے لیے بہت حکمت استعمال کی۔ بہت تگ ودھ کی یہاں تک کے اوپر بیان کی گئی چالبازیاں اور مکاریاں بھی استعمال کیں لیکن ناکام رہا۔ مگر تنظیم اور افرادی قوت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ لیکن یہ صورتحال کے اہم جُز ہیں۔ جنکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن صرف یہی حقائق نہیں ہیں۔ مثلاً پڑھے لکھے کیتھولک کلیسیا کے مومنین کو قائل کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

کارڈنیل نیومین اور ہیوڈبرون گزشتہ صدی کی دو عظیم شخصیات ہیں جنہوں نے اس موضوع پر کام کیا ہے اور اپنی تشریح پیش کی ہے

۔اگر ہم اس صدی مُس ان دونوں ناموں کو یکجا کر دیں تو ظاہر ہے کہ تنظیم کو ان دونوں شخصیات کو ایک پیش کرنے کے لیے مشکلات کا سامنا تو کرنا پڑے گا۔اگر ہم اس کام میں رومن کیتھولک کلیسیا کو شعبہ تعلیم کے لحاظ سے ہی اگر بیان کرنا چاہیں تو وہ بہت پڑھے لکھے ہیں۔

اور اگر ہم اس بات کی تشہیر کرتے ہیں تو ذہین لوگوں کے ایک اور طبقے کے لیے یہ تحریک کا باعث بنے گا۔اگر ہم رومن کیتھولک مُصنفین کے لکھے ہوئے مضامین، کتابوں، رسالوں کی فہرست جاری کریں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ یہ تعداد میں اتنے زیادہ ہیں۔

میں ان کتابوں کے مواد کی بات کر رہا ہوں جو الٰہیات اور فلاسفی سے ہٹ کر ہے۔۔۔۔۔

کیتھولک مُصنفین نہ صرف الٰہیات، فلاسفی پر لکھ رہے ہیں بلکہ علم الانسان، علم النباتات، تعلیم، تاریخ اور سیاست کا شعبہ بھی اُنکے قلم کے زیر اثر ہے۔اُن کی تصانیف تعداد میں بہت زیادہ ہیں جو قابلِ تعریف بات ہے۔اتنی زیادہ تعداد میں کتابیں لکھنے کا مقصد رومن کیتھولک کلیسیا کا ہر شعبہ زندگی پر آہستہ آہستہ مگر باضابطہ انداز میں حملہ کرنا ہے۔لکھاری نفسیات پر قلم اٹھائے یا سیاست پر وہ لوگوں کے لیے عملی اقدامات ہمیشہ تھامس کی متعارف کردہ حکمت کی روشنی میں لکھے گا۔لیکن مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو انکی تصانیف بڑی پُر تاثیر ہوتی ہیں۔اب رومن کیتھولک کلیسیا اپنے یورپین عتیق، اپنے باحشمت شعور ماضی کے ساتھ، آہستہ لیکن ارادہ ہمنی کے ساتھ امریکہ میں مقیم پروٹسٹینٹ لوگوں تک رسائی حاصل کر رہی ہے۔وہ جدت پسند ہوں یا راسخ الاعتقاد ہوں۔روم کیتھولک کلیسیا اپنا اعلیٰ وارفع معیار اُن پر ظاہر کر رہی ہے۔

اب جب نظام اور اُسکی خاصیت دونوں اکٹھی ہو جائیں گی تو یہ لوگوں کو نفسیاتی طور پر متاثر کرینگی۔پروٹسٹینٹ ازم دو باتوں سے نقصان اٹھائے گی۔ای تو انکا کوئی سسٹم نہیں ہے دوسرا یہ قابلیت و خاصیت سے بھی قاصر ہیں۔اب پروٹسٹینٹ پڑھا لکھا طبقہ ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کیتھولک مقررین کو دعوت دے رہا ہے۔

یا پھر کبھی کبھی وہ آرتھوڈکس مقررین کو اپنے گھروں میں بُلا لیتے ہیں اگر وہ موجود ہوں۔اب کسی مومن کو چرچ میں ڈیسک پر بیٹھے ہوئے یا کسی

مبشر کوکوئی ایسی غلطی نہ کرنے دیں۔ اب بہت پڑھے لکھے معاشروں کی تعداد کل آبادی کی تعداد سے کہیں کم ہو کر رہ گئی ہے۔ اب یہ پڑھا لکھا طبقہ اپنے خیالات ،نظریات اور سوچ دوسری تہذیبوں کے ساتھ بانٹے گا۔ اور اگر اس پڑھے لکھے طبقے نے رومن ازم کی حمایت کر دی یا جدت پسندی کو زندگی کے لیے مناسب قرار دے دیا اور روحانی تصورات کو خیر باد کہہ دیا تو پھر معاشرہ دو حصوں میں منقسم ہو جائے گا۔ اور اس روحانی اور روائتی طرز زندگی کو بالکل چھوڑ دے گا۔ اور جدت پسندی کے راستے کو اپنا لے گا۔ اب بشارتی اور پاسٹرل کام کی یہ ذمہ داری ہے کہ لوگوں کے گھروں کے وزٹ کے دوران اس خطرے پر قابو پانے کے لیے اہم کردار ادا کریں۔ لوگ گجا گھر میں جاتے ہیں اگر چہ وہ آرتھوڈکس کلیسیا کی حمایت میں ہوں یا نہ ہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی خدا کے کلام سے توجہ ہٹتی جا رہی ہے۔ اور اگر یہ خلا بڑھتا چلا گیا تو پاسٹر کے لیے اس کو پُر کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ لیکن ان دنوں میں جب کتابوں، ریڈیو اور روائتی یا موسمی فلموں کی مذمت کی جاتی ہے۔ آرتھوڈکس کی حیثیت کو رد کیا جاتا اور مذاق اڑایا جاتا ہے۔

جب وہ دوسرا مذہب اپنانے کی کوشش کرتے اور اُسکی نفسا نفسی سے بھر پور الہیات سے گمراہ ہو جاتے ہیں تو ایک پاسٹر کے لیے اُنکو اقدس ثالوث واحد خدا کی طرف لانا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً کے طور پر ریڈرز ڈائجسٹ میں مذہب، دعا اور کلیسیا کے متعلق چھپنے والے مضمون نے لوگوں کی زندگیوں پر کافی اثر ڈالا ہوگا۔ یہ مضامین مذہبی ہیں۔ اور گرجا گھر جانے کی ترغیب دیتے ہیں لیکن یہ مسیحیت پر سوچا سمجھا حملہ ہے۔ اگر لوگوں کا رجحان فلاسفی کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف ہے۔ اور اگر یہ فلاسفی تمام علوم کی آمیزش کا نتیجہ ہے اور اگر یہ آمیزش اُن تمام اصولوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی جنکے ذریعے لوگوں کو کنٹرول کیا جاتا ہے تو پھر کسی کو حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ رومن نمائندے نے ایک باب نائٹ آف کولمبس سے دس نوجوانوں کو فلاسفی کی تعلیم دلوانے کے لیے مالی امداد کا کہا تو اس نے جواب دیا کہ آئندہ لڑنے والی جنگ فلسفے کے میدان کی جنگ ہوگی۔ تو پاپائیت کو اس جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ پھر اس ساری بات کو ایک لمبے عرصے کے لیے پلان کر لیا گیا۔ تا کہ اس سے نکلنے والے نتائج کا سامنا کیا جا سکے۔

گزشتہ صدی کے اختتام پر، کیتھولک چرچ جدت پسندی کی غیر تنظیمی دباؤ کا تجربہ کر رہا تھا۔ کیا کلیسیا کی قیادت جدت پسندی کی اس لہر کو آزمائے بغیر فروغ کی اجازت دیتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کلیسیا میں فلسفے کا خلا پیدا ہو جائے جیسا کہ پروٹسٹینٹ ازم میں ہے۔ لیکن نئی صدی کے آغاز پر پوپ پائس دہم نے اپنے رسولی خط اور دوسرے پاسٹرل خطوط میں جدت پسندی کی مذمت کی اور جلد ہی اس کے حمایتی تیتر بیتر ہو گے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج رومن سکالرز اپنا اچھا کردار ادا کرتے ہوئے کلیسیا کو استحکام دے رہے ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے خیالات کا الگ الگ انداز میں اظہار کرتے ہیں لیکن وہ تمام تھامس کے خیالات کا ظہور ہیں۔

پروٹسٹینٹ ازم میں کوئی کلیسیائی مشینری نہیں ہے جو خاص طور پر فلسفے کے سسٹم کو مضبوط کرے۔ اور ہم مستقل طور پر یہ اُمید کرتے ہیں کہ اس میں کوئی ایسی مشینری نہیں ہوگی۔ یہاں تک کہ کسی خاص دائرے اور حد مُن رہ کر کام کرنے والی بھی کوئی ایسی فلسفیانہ مشینری تشکیل نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ یہ بات نا قابل تسلیم اور نا قابل برداشت ہے۔ بلکہ ہم اس بات پر توجہ دینگے کہ وہ کونسے فلسفیانہ نکات ہیں جو ایمان کی اصلاح کر کے اُسکی تعمیر کرینگے۔ اگر ہم سیہر کوئی انفرادی اور ذاتی طور پر حقائق کی صفائی سے قائل ہو جائے گا۔ کہ یہ فلسفیانہ سوچ صحیح ہے تو ہم سب اُسے ملکر یہ شعبہ زندگی میں فروغ دینگے۔ اور ایک باقوت اور متحد کلیسیاء حاصل کرینگے۔۔۔۔۔۔

اتنی بنیادی سطح سے یہ کام شروع کرنا کیا یہ اسموقع پر بہت دلیری کا کام نہ ہوگا؟ اس قسم کا مشورہ دنیا کہ کام اب سے شروع کیا جائے اور اس کے ثمرات آپ کو مستقبل بعید میں ملیں اور وہ بھی شاید اُس طرح نہیں جس طرح آپ نے سوچ رکھا ہو تو کیا یہ سنجیدہ اور مشکل نہیں۔ دوسری طرف آپ میں سے شاید یہ بھی سوچ رہے ہونگے کہ یہ کام اتنی بھی دلیری اور مشقت کا نہیں جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔ کچھ بھی ہو کیا ہم سب اس بات پر متفق ہونگے کہ آگسٹین کی جنرل فلاسفی سب سے زیادہ قابلِ تقلید ہے؟ روانگی کے لحاظ سے آگسٹین کے انتخاب کا نقطہ اتنا آسان نہیں ہے کہ اسے تھامس پر تھونس دیا جائے انتخاب کیا جا سکتا ہے بلکہ بہتر انتخاب، انتخاب تو خود مدہم اُمید کا مشورہ دیتا ہے۔ وہ فلاسفر جس کی فلاسفی میں بائبل مقدس کے فضل کی تعلیم جھلکتی ہو۔ وہ ہمارے فلسفیانہ انتخاب میں مدد دے سکتا ہے۔

پہلے پہل یہ آپکو بہترین مشورہ لگے گا۔لیکن بعد میں یہ آپکو فضول محسوس ہوگا۔ جو آگسٹین کی رہنمائی میں راستہ کا انتخاب کریگا وہ راستہ کٹھن ہوگا بجائے اُسکے جو تھامس کی پیروی کریگا۔ کٹھن اس لحاظ سے کہ جتنی آسانی کے ساتھ آپ تھامس کی فلاسفی سمجھیں گے اتنی آسانی سے آگسٹین کا فلسفہ آپکی سمجھ میں نہیں آئے گا۔لیکن بعد میں آپکو محسوس ہوگا۔ کہ جتنا آسان اگسٹین کا فلسفہ سمجھنا ہے اتنا شاید کوئی دوسرا نہیں ۔ تھامس ہر بات کی وضاحت دیتا اور گہرائی میں جاتا ہے لیکن آگسٹین بہت سارے سوالوں کو لاجواب چھوڑ دیتا ہے ۔اگر رہنمائی مکمل طور پر میسر نہ ہو تو ہوسکت اہے کہ ہم اپنا راستہ بھول جائیں ۔اگر تھامس سے آپکو نامکمل کو مکمل کرلیں ۔اس لیے ترقی مشکلات کے حل کے لیے توجہ کا مطالبہ کرتی ہے ۔جدید اگسٹین ازم کو اس کے آبا کی تعلیمات کی روشنی میں وضاحت اور گہرائی ملنی چاہیے ۔خدا کی بادشاہت کے متعلق وسیع سوچ تمام کائنات اور اس کے وجود کو برقرار رکھنے والیسائنس اور الہیات کو بھی متاثر کرتی ہے۔

جو اسے واحد، منظم، قابلِ فہم نظام تشکیل دینے کے لیے لازمی اور بھرپور قرار دیتی ہے ۔لیکن اُنکی قابلیت کا ایک ہی ثبوت ہے کہ اُنکی فزکس ،نفسیات، تعلیم اور سیاست کے لیے دی گئی وضاحت قابلِ تسلیم ہے ۔لیکن ایک اگسٹین کو اپنے آپ کو ہیگل کی تنقید سے محفوظ رکھنا پڑیگا۔ کیونکہ وہ کہت اہے کہ اگر ہم اس پھیلے ہوئے نظام کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا۔ کہ یہ کسی ایک اور یکساں اصول کے تحت تشکیل نہیں دیا گیا ۔بلکہ یہ ایک اور یکساں اصول کی بدقطع شکل ہے ۔جس کو بار بار دھرایا گیا ہے ۔جسے باہر سے منفرد نظر آنے کے لیے اپنایا گیا ہے ۔ اسے ہر طرح کے لوگوں کو اکٹھا رکھنے کے لیے اپنایا گیا ہے ۔یہ خیال تو خود میں سچائی نہیں ہے ۔یہ کب اور کہاں سے شروع ہوا اور کتنی ترقی اس کے مرہون منت ہے کوئی نہیں جانتا صرف یہ ایک ایسے کلیے کے ذریعہ ممکن ہوا جسے بار بار دھرایا گیا ہے۔

افلاطون نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ طالب علم کو ایک دم غیر یقینی صورتحال کا سامنا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مایوس ہوکر دوبارہ بھی پلٹ آئے ۔بنیادی اتحاد بڑے اختیار کے ساتھ کنٹرول رکھا جانا چاہیے ۔اس سے پہلے کہ اسکو شاخوں میں تقسیم کرو۔ پڑھے لکھے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ مختلف مسائل کا اصلاح شدہ ایمان کے ذریعے قابلِ قبول حل پیش کریں ۔

آؤ مختلف مثالیں لیں ۔ نہ صرف ساری فلسفیانہ روح کے حوالے سے بلکہ وہ مثالیں جو فلسفے کی اُس شاخ کی ہوں جو علم پر تذکرہ کرتی ہے آؤ پوچھتے ہیں اگر اگسٹین ازم ان سوالوں کے جوابات دے پاتی ہے ۔کیا علم اُس عمل کا نتیجہ ہے جس میں ہم سوچتے ہیں اور سوچنے کے بعد خیال یا تصور کو ذہن میں لاتے ہیں اور وہی خیال یا تصور کا جب اظہار کیا جاتا ہے تو ہو علم کہلاتا ہے ۔ کیا ایسا ہے؟ یا یہ عمل ہوتا ہی نہیں ۔کیا لفظ (تصور) کسی ٹھوس خیال کی شکل کا نام ہے؟

کیا ہم کو کہنا چاہیے کہ صرف کند ذہن ہی ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے اور فضول چیزوں کو خیالی طور پر محسوس کرتا ہے؟ یا جب یہ چیزیں ہمارے دماغ میں گھومتی رہتی ہیں تو کیا یہ ہماری محسوسات میں کسی کی شکل بن کر سامنے آسکتی ہیں ۔شاید ریٹینا پر دیکھ سکیں ۔یا پھر کسی بیرونی چیز میں بھی دیکھ سکتے ہیں ۔دوسرے مضامین کے بارے میں بھی ایسے سوالات ہیں مثلاً سیاست، ایجوکیشن اور علم جمالیات یہ شاید پوچھنے کی بجائے سوچے جاسکتے ہیں ۔

ابتدائیہ موقع پر یوں سوالات کو لاجواب چھوڑنا نامناسب لگتا ہے لیکن یہ یقیناً اتنا خطرناک نہیں ہے ۔لیکن کسی مسئلے کے متعلق گفتگو کو ادھورا چھوڑنا درحقیقت مشکل بات ہے ۔آپ میں سے کچھ اگسٹین ازم اور کچھ دوسری فلاسفی کو اپنانا چاہتے ہونگے لیکن آؤ درمیانی راہ اپناتے ہیں اور صلیبی اور پیچیدہ مسائل کو حل کرتے ہیں جو حساسیات اور سائیکوفزکس کے متعلق ہیں ۔

جدید نفسیات کی تاریخ میں روح اور جسم کے باہمی تعلق کی تحقیق بہت پیچیدہ ہو کر رہی گئی ہے کیونکہ اس عمل کے ذمہ داران شعور کی سطح کے مکینکل نتائج کا مطالبہ کرتے ہیں ۔لیکن قیاس یہ ہے کہ شعور کی سطح مکینکل عمل انجام دے سکتی ہے لیکن دیکھنا پڑے گا کہ کیا یہ عمل دھریا جا سکے گا۔ کیونکہ اس میں اہم کردار حساسیات کا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے یکساں نتائج حاصل کرنا ناممکن ہے ۔۔۔۔۔۔

اس لی مظاہر پرستی جیسے ایک لحاظ سے ناممکن قرار دیا گیا تو دوسری طرف سرے سے اس کا انکار کر دیا گیا اور اس طرح اس کا وجود مایوس کن انداز سے نظر انداز کر دیا گیا ۔ان نظریات کا نتیجہ سپائنوزا اور دوسری فلسفیاتی بنیادیں جو مثالیت پسندی کے بارے میں تھیں انکورد

کرتے ہوئے یکسانیت پسندی کو قبول کر لیا گیا ۔ اس طرح اس مسئلے کا اختتام نہایت مایوسی میں ہوا جو قابل رحم ہے ۔فلسفیاتی مسئلے کی اُلجھنیں اور نفسیاتی مواد کی پیچیدگیوں نے تمام دریافتوں اور معلومات کے باوجود اس مسئلے کو اور زیادہ بگاڑ دیا ۔

مثالیت پسندی ہمیشہ سے ایک ایسا حل رہی ہے جو ذہنی وجود کے تمام دُنیاوی خواص کی مشکلات کو کم کرتی ہے بری ہچکچاہٹ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس نظریے کو بڑے نامناسب انداز میں پرکھا گیا تاہم مثالیت پسندی کے نامعلوم وجود کے نظریے کو رد کر دیا تاکہ تشکیک پسندی کو ختم کی اجا سکے ۔لیکن پھر بھی مثالیت پسندی کے اصولوں نے محسوسات کی راہ میں حائل مشکلات کو عملی طور پر نظر انداز کر دیا ۔ اور اس کی وجہ جاننا کوئی مشکل امر نہیں ہے ذہنی وجود کے مادی خواص ہوں یا نہ ہوں ۔تحریک سے متعلقہ مسئلہ وہی پہ رہتا ہے جسے ہم حسیاتی شے کا نام دیتے ہیں ۔

مگر یہ بہت قدیم تو ہوسکتا ہے مگر سائنسی نہیں ۔ اگسٹین جس نے حسیات کا گہرا مطالعہ کیا اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگر جدید مُصنفین ہمیں بہت کم اُمید دیتے ہیں پھر کوئی دوسرا ذریعہ ہماری مدد نہ کرے گا ۔تاہم اگسٹین اور نئے افلاطونی نظریے سے ہمیں ان سوالوں کے کچھ حد تک جواب ملتے ہیں اور یہ جواب ہمیں درست سمت میں لے جاتے ہیں بجائے اس کے کہ ہمیں کسی اندھی کھائی میں رکھیں ۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ حسیات کو عمل کے ذریعے بیان کرنا ایک ایسا امر تھا ۔ جسے ابتدائی مُصنفین نے خیال کیا کہ عمل روح سے حسیاتی اشیاء میں مُنتقل ہوتا ہے ۔ اگر ہم کسی حسیاتی چیز کو اپنے سامنے رکھیں تو ایک صحت مند ریٹینا Retina اور حسیاتی نظام جیسے روشنی کی شعاعیں مل جائیں تو وہ آنکھ کی پتلیوں سے گذر کر دیکھنے کے قابل بناتی ہے ۔ اور اسکے لیے ہمیں کسی جدید میکانکی نظریے کی ضرورت نہیں ہے ۔کہ رنگ کس طرح نظر آتے ہیں ۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ جسمانی حالت یہ بیان نہیں کرتی کہ رنگوں میں امتیاز کس طرح کرتا ہے ۔ بہت سارے لوگ آسمان کی طرف دیکھتے ہیں جو نیلا ہے اُنہیں اس کا رنگ سبز ، جامنی یا گلابی نظر نہیں آتا ۔ درخت ہمیشہ سبز ہی نظر آتے ہیں ۔لیکن اگر نہی لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ ان رنگوں کا موازنہ کیا جائے انہیں معلوم ہوگا کہ بہت سارے رنگ ایسے ہیں جو وہ پہلے سے ہی دیکھ رہے

تھے ۔یہ نقطہ اگسٹین کے نظریے کی حمایت کرت اہے کہ ہماری حسیات توجہ اور ہماری مرضی پر انحصار کرتی ہے اور وہ یہ کہ ہم کسی چیز کو بہتر طریقے سے جان سکتے ہیں بجائے اس کے کہ اُسکے اثرات ہم پر ظاہر ہوں لیکن پھر بھی اس بات کو مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ یہ محض رنگوں کا امتیاز نہیں ہے یہ اُن تمام چیزں کا بھی احاطہ کرتی ہے جو سُنی جاسکتی ہے جس کے لیے توجہ کی ضرورت ہوتی ہو۔حسیات کے مسائل کا مطالعہ کرتے ہوئے کوئی اس قدر مستغرق ہو جاتا ہے کہ حسیات غائب ہو جاتی ہیں ۔کھلی آنکھیں شاید کچھ سُنے ہم کھانے کی طرف چل دیتے ہیں ۔اس لیے محسوسات کے لیے رضا کارانہ عمل بے حد ضروری ہے یہ سُننے میں ہمیں شاید کچھ فلسفہ سا لگے جس طرح آرتھوڈکس الہیات یا شستا انگریزی ہمیں بتاتی ہے ۔کہ دنیا میں اُس سے بڑھ کر اندھا کوئی نہیں ہے جو ہمیشہ کے لیے دیکھ ہی نہ سکے ۔یہ نظریہ ہمیں ایک ایسی روشنی میں لے جاتا ہے جو ہماری آنکھوں کو چندھیا دیتا ہے ۔اور یہ غیر رضا کارانہ سمجھ ہوسکتی ہے لیکن یہ مشکلات بہت ہلکی معلوم ہوتی ہیں ۔جب اُنکا موازنہ دوسری نظریات کے ساتھ کیا جاتا ہے ۔

اگسٹین کا نظریہ ایک ایسے بیرونی عمل پر زور دیتا ہے جو کہ میکانکی عمل نہیں ہے ۔اسطرح یہ اُس غلط نظریے کو رد کر دیتا ہے جو کانت حسیات اور ذہانت کے درمیان قائم کرتا ہے اور یہ مکمل طور رد کر دیا جائے گا۔صرف اسی سے نہیں کہ برطانیہ کے ماہرین حسیات کی پیچیدگی کو ذہن کی ایک حالت قرار دے سکیں ۔مگر اس کے برعکس ذہنی عمل کو اگر جان لیا جائے تو یہ شعور کی نہایت سادہ سطح ہے ۔حتی کہ وہ تمام مفکرین بھی جو کہ عملیت پسندی سے متاثر تھے انھوں نے بھی یہ جاننا شروع کیا کہ خالص حسیات کا قدیم نظریہ محض سیرابِ نظر ہے ۔کوئی بھی ایف آر ٹینٹ کو اگسٹین کے نظریے کا حامی ہونے پر الزام نہیں دے سکت الیکن پھر بھی وہ اپنی کتاب ،فلسفیاتی الہیات ،(والیم 1 ،صفحہ نمبر 41) میں یوں لکھتا ہے کہ جتنا زیادہ ہم اپنی حسیات کو سمجھتے ہیں ۔اتنا زیادہ ہم اُنکے محسوسات کو سمجھ لیتے ہیں ۔اس طرح ہم علم کی فطری تشریح کے امکان کو ختم کر دیتے ہیں ۔۔۔۔

سنوارتھ مور کے پروفیسر بلون شرٹ اپنی تحریر، خیال کی فطرت، میں جو کچھ بیان کرتے ہیں ۔اُسے واضح طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔

ہم دنیا میں رہتے ہیں تا کہ اس سے راہِ فرار حاصل کر سکیں یہ بات سچ ہے کہ ہمیں یہ پڑھنے کی ضرورت نہیں کہ شروع میں کیا ہے جسے دراصل بعد میں آنا چاہیے۔لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ ہمیں بعد والے نظریے کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ ہربرٹ سپنر نے ایک دفعہ نظریہ پیش کیا کہ حسیات کی خصوصیات بیان کی جاسکتی ہیں اگر انھیں ایک تسلسل کے ساتھ حسیاتی نظام میں رہ کر سمجھا جائے اور اگر یہ نظام شعور کے دائرہ کار میں لیا جائے تو یہ نظریہ بے حد دلچسپ ہو جاتا ہے اور اگر انہیں حسیاتی نظام میں کسی ایسی جگہ پر رکھا جائے جو خیال کا بالکل شروع ہو تو یہ ایلوڈجینوس کا امکان بعید الا ادراک ہو جاتا ہے اور اس نظریے کو وہ ایک اور جملے میں یوں بیان کرتا ہے۔ہم بیان کرنا نہیں جانتے کہ کس طرح کوئی چیز کہنے سے ابھر سکتی ہے جبکہ وہ اپنی بنیاد ہی سے بالکل فرق چیز ہو۔ بظاہر سوچ اور علم خالص حسیات سے حاصل نہیں کیا جاسکتا یا دوسرے لفظوں میں حسیاتی تجربہ اور عقلی علم کے درمیان تعلق کو محفوظ رکھنے کے لیے حسیات کو ذہنی شکل میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔

دو اقسام کے ذہنی عمل ہمیشہ متحد ہو جاتے ہیں۔ اور اگر فلسفہ میں مختلف تجربات کیے جائیں تو اُسکا نتیجہ تشکیک پسندی کی صورت میں اُبھرتا ہے۔جبکہ یہ الہیات میں مکاشفہ یا الہام کو یکسر مٹا دیتا ہے۔جسکی وجہ سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ اسے خیال کی اصلاح میں بیان کیا جاسکتا ہے تاہم یہ بنیادی مشاہدات تکنیکی بننے کے خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ایک دفعہ نوجوانوں کو ایک نصیحت کی گئی کہ وہ ہر حال میں کائناتی سچائی کے آسمان پر اُڑان کر سکیں آپ سب جو تعلیم یافتہ ہو آج سکول سے جا رہے ہیں۔تا کہ عملی زندگی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔آپ ایک دوسرے سکول میں جا رہے ہیں۔ جہاں آپ کو اسائنمنٹس دیئے جاتے ہیں۔پھر چرچ کے بہت سارے مالی مسائل ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے فرقے بھی ہیں۔علاوہ ازیں مختلف تنظیموں اور اداروں کو چلانا اور اُنکی تعداد میں اضافہ کرنا (مقدسین کی تعظیم کرنا اور ابلسی مخالفت سے مُکرانہ) جو کے دن میں بڑھ رہی ہے۔اس روشنی میں کیا کوئی متر آپ پر مزید بوجھ ڈال سکتا ہے۔اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ آپ پر بوجھ نہ ڈالیں۔

خدا کو ہم اپنی ذہنی صلاحیت کے ساتھ پورے طور پر نہیں سمجھ سکتے خدا نے مختلف ادوار میں مختلف ذرائع استعمال کرتے ہوئے خود کو

ظاہر کیا۔لیکن مقدس پولوس ، اگسٹین ، کیلون اور مچن کی زندگیاں جنہوں نے مختلف صدیوں میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا ۔ یہ ہمیں لاعلمی کا شکار ہونے سے بچائے رکھتے ہیں ۔اس لیے آپ سب اکتالیس طلبہ اپنے استاد کی باتوں سے کبھی مایوس نہ ہوں اور اس بات کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیں کہ آپ اصلاحی ایمان کے فروغ میں اپنا نمایاں کردار ادا کرینگے ۔

ایک خادم تھا جسے اپنے دیگر ساتھیوں کے بارے میں علم نہ تھا اُس نے پنتالیس سال تک ایک جماعت کی خدمت کی وہ دو واعظ تیار کرتا اور ہفتے عبادت کا اہتمام کرتا وہ لوگوں سے گھروں میں جاتا مختلف تنظیموں سے میل جول رکھتا ۔اس انتھک محنت کی وجہ سے وہ کافی بیمار ہوگیا ۔لیکن پھر بھی اُس نے کچھ آرٹیکلز لکھے اور دو کتابیں شائع کیں ۔جن میں سے ایک کتاب نہایت ہی مستید ہے ۔

تصور کیجیے کہ آپ عملی زندگی میں قدم رکھ چکے ہیں ۔ جہاں عُلما کی اشد ضرورت ہے اُن مضامین کا انتخاب کیجیے جو آپ الہیات ، اداب اور معاشیات میں دلچسپی پیدا کریں ۔اپنے آپ میں سے ہر چیز کے بارے میں جاننے کی طلب کو کم کریں ۔لیکن فیصلہ کریں کہ جو کچھ سیکھیں اُسے ضروری حدوں میں رہتے ہوئے سیکھیں اور اس بات کا بھی خیال رہے کہ آپ اگلے دس سالوں میں کوئی معیاری اور مستید تحریر لوگوں دے سکیں گے ۔کیا یہ عقلی امکان سے باہر ہے کہ ایک پاسٹر بیس یا پچیس صفحات بھی دس سالوں میں نہیں لکھ سکتا ؟ تاہم اسکے برعکس کچھ رجعت پسند یہ خیال کرتے ہیں کہ دس سال ایک طویل عرصہ ہے ۔لیکن اس کا ذکر ہی کیوں کیا جائے ۔ پانچ سال ہوں یا پندرہ ،عرصہ اتنا زیادہ اہم نہیں جتنا معیار ہونا چاہیے ؟ اور دوسرا آرٹیکل کم وقت کا تقاضا کریگا ۔جس میں پہلے سے زیادہ معیاری مواد ہوگا ۔کسی ایسے شخص کی مدد کرنا جو اس طرح کے آرٹیکلز تیار کرتا ہو ،تنقید کے ذریعے اُسے مزید نکھارا جاسکتا ہے اور یہ صرف ایک کیلون ٹیسٹک فیلوسوفیکل سوسائٹی کو جنم دینا ہی نہیں لیکن کیلون ٹیسٹک عُلما کے معاشرے کی تلاش ہے ۔ایسا معاشرہ اگر کچھ تکنکی مواد فراہم کرسکتا ہے تو اُمید رکھی جاسکتی ہے کہ اسے شائع بھی کیا جاسکے گا ۔لیکن ہمیں اپنا پیسہ بچانے کے لیے موجودہ وقت کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ۔ہم کیوں اپنا پیسہ ناجائز ذرائع سے استعمال کریں ؟ بہت سارے ایسے تکنیکی جرائد ہیں جو کہ معیار کو فوقیت دینگے ۔معیار کی کسوٹی پر صلاحیت کو رکھا جاسکتا ہے اور اُس

پر عمل کرتے ہوئے بہترین آرٹیکلز اکٹھے کیے جا سکتے ہیں ۔جس کے بعد ہی ایسے منصوبہ جات تشکیل دیئے جا سکتے ہیں ۔جن سے ہم اپنی شناخت حاصل کر سکتے ہیں ۔

اے خداوند ہم پر اپنا نور چمکا۔

اور ہم پر اپنی سچائی کا نور نازل فرما تا کہ وہ ہماری رہنمائی کر سکے۔

میں نے بہت ہی دلچسپ پیرا یہاں تحریر نہیں کیا جو بتاتا ہے کہ انسان اپنی زندگی کے شروع سے لے کر آ کر تک کام کرتا ہے یہ سارے کام وہ دوسروں کی مرضی کے مطابق کرتا ہے ۔وہ خدا اور اُسکے احکامات کے تحت زندگی گذارتا ہے ۔اُسکی اپنی مرضی کسی بھی کام میں شامل نہیں ہوتی ۔جسے وہ غلام ہو اور خدا اُسکا مکمل طور پر آقا ہو۔ اگر جان گل کی استعمال شدہ اصطلاح (کوایشن) کو بیسویں صدی کے انگریزی دور میں استعمال کی جائے تو اُسکا مطلب ہوگا کہ انسان زندگی میں ہر طرح کی مجبوری اور بے بسی سے آزاد ہے ۔لیکن اُسکی مرضی خدا کے ماتحت ہے اور یہ خدا جو ہمیں کوئی بھی کام کرنے کے لیے مائل کرتا ہے ۔یہ ویسٹ منسٹر کے ایمان X1 کا IX-3 کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہوا ہے ۔

6 ۔اصلاح کار اور اصلاح کی ہوئی الہیات ،پہلی بار 1862 میں لندن میں شائع ہوئی 1967-524-471۔۔۔۔۔۔۔